طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

(علامہ اقبال مرحوم)

طرحِ نو

اثر ــــــ نذیر میرزا برلاس ایم، اے

ناشر

مکتبۂ اردو لاہور

٨

باہتمام چودہری نذیر احمد پرنٹر و پبلشر انتخاب پریس گنپت روڈ لاہور میں چھپ کر
مکتبۂ اردو لاہور سے شائع ہوئی

قیمت ۶ر

فہرس

مشاہدات

تاثرات

گزارش

اگرچہ دوسروں کی طرح میرا ذوقِ سخن بھی ایک خاص انفرادیت رکھتا ہے۔ جسے نہ قدامت پسندی سے بہت دلبستگی ہے۔ نہ "مستقبلی دبستان" سے متاثر ہونے کا جنون ——— لیکن میرے ذہن کے تنقیدی پہلو کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی ہے۔ کہ جن شعرا نے اپنے اپنے دَور، اپنی اپنی خصوصیات اور اپنے اپنے موضوعِ فکر میں کمال پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کسی سے بھی مجھے نفرت نہیں ہے بلکہ میں ہمیشہ اُن کے انفرادی اقدار کے لحاظ سے اُن کی پایہ شناسی کی کوشش کرتا ہوں اور میرے نزدیک یہی صحیح نقادانہ نقطۂ نگاہ یہی ہے۔

اگر آپ غالبؔ و اقبالؔ کو شدت سے پسند کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہ ہونا چاہیئے کہ آپ داغؔ و امیرؔ کے دشمن ہیں۔ بلکہ آپکے ذہن میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے۔ کہ آپ آخرالذکر دونوں کی اختیار کردہ یا اتفاقی خصوصیات کی بھی قدر کر سکیں۔ فرقِ مراتب زندگی کے تمام پہلوؤں میں مسلّم ہے۔ آپ کسی شاعر کو اچھا اور کسی کو کم از کم اچھا سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن "یکطرفہ ڈگری" عامیانہ روّیہ ہے اگر آپ کو میٹھی چیزیں کھانے کا بے حد شوق ہے۔ تو کسی کو آپ کے اس شوق سے تعرض کی ضرورت نہیں۔ لیکن مذاقِ صحیح اس کا نام ہے۔ کہ آپ میٹھے کے شوق کے ساتھ ہی ساتھ نمکین اور ترش ذائقوں کی خوبی سے بھی آشنا ہوں۔ کیونکہ یہ ذائقے بھی اپنی جگہ کافی لذت رکھتے ہیں۔ اُن سے کاملاً انکار کر دینا بہت ہی سطحی اور عامیانہ زاویہ نگاہ ہے

آج کل اردو کی شاعری میں انقلابی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے ظاہر و باطن پر جلد رومانیت کا اثر چھایا جا رہا ہے۔ رومانیت تو اس سے پہلے بھی کافی سے زیادہ تھی۔ لیکن وہ محض

تصوّر کا دَور تھا۔ اب مشاہدے کی گرم بازاری ہے۔ حقائق نگاری کا دور دورہ ہے۔ پُرانے اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن پرانوں کا یہ شیوہ پُرانا ہے۔ بہرحال نوجوان شاعر لفظی و معنوی روایات کی زنجیریں توڑ دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ پھر ان شاعروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے۔ جو اِن قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل چکی ہے اور اسی قسم کو میں نے اس مضمون کے آغاز میں "مستقبلی دبستان" سے موسوم کیا ہے۔ اِس قسم سے مجھے فی الحال بحث نہیں۔ اس لئے کہ انقلابی حرکت میں افراط و تفریط کے درمیان نقطۂ اعتدال پر قائم رہنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ لیکن دوسری قسم نسبتہً سلامت رَو شعراء کی ہے۔ جو اردو کی شاعری میں نئے اسالیب کو داخل کرنے کے شوقین تو ہیں۔ لیکن اپنے ملک۔ اپنے ماحول۔ اپنی روایاتِ ادبی اور اپنی زبان کے "مزاج" سے تغافل نہیں برتتے۔ بلکہ اُنکی روحیت کو محفوظ رکھ کر قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ انہی میں "طرحِ نو" کے مصنف نذیر مرزا برلاس ہیں جن کے کلام کا مطالعہ نقاد کے دماغ میں غرابت یا غیر مانوسیت کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک خاص قسم کی نوی اور شگفتگی کا تعارف کراتا ہے۔ نذیر مرزا برلاس کی دنیا وہی حسن و عشق کی دنیا ہے جس سے ہم سب کے دل آشنا ہیں۔ البتہ اُس میں پرانوں کی حرماں نصیبی اور زار نالی غالب نہیں۔ بلکہ ایک رجائیت کی ہے۔ جو ذہن کو آزردہ و افسردہ نہیں کرتی۔ بلکہ اس میں تازگی اور روشنی داخل کرتی ہے۔

نذیر مرزا نوجوان ہیں۔ خدا انہیں ہمیشہ نوجوان رکھے۔ یعنی ان کے تخیّل کا شباب ہمیشہ قائم رہے۔ اُن کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔ اُن کے ناصیۂ سخن پر "ستارۂ بلندی" چمک رہا ہے خدائے شعر اسی ستارے کو آفتاب بنائے ؛

عبدالمجید سالک

لاہور ۱۴ر نومبر ۴۱ء

مقدمہ

پروفیسر محمد موسےٰ خاں صاحب کلیم افغانی ایم۔ اے۔ دار العلوم اسلامیہ پشاور

مقدمہ نگاری بے شک ایک بہت بڑا فن ہے جس کے مفید ہونے میں ذرا بھی کلام نہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ آجتک نہ آیا کہ شعر و سخن کے کسی مجموعہ کا مقدمہ کیوں لکھا جاتے۔ بنوشی سے پہلے شراب کی تعریف کیوں کی جائے، رقص و سرود کی محفل جمانے سے پہلے ان دلآویز فنون کے حسن و قبح پر کیوں بحث ہو۔ ان چیزوں کا تعلق احساسات سے ہے اور ان کا اثر پینے اور پلانے، سننے اور سنانے، دیکھنے اور دکھانے ہی سے ہو سکتا ہے۔ برناڈشا کے کسی فکری ڈرامہ یا علامہ شبلیؒ کے سیاسی مقالات کا مقدمہ لکھا جائے تو وہ پڑھنے والوں کے لئے مفید ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ کبھی موضوع کی اہمیت اور مفکر کے نظریۂ حیات کی توضیح مطلوب ہوتی ہے اور کبھی اس خاص رجحان کا پتہ لگایا جاتا ہے جس کے ماتحت وہ تحریر عمل میں آئی۔

شاعر کا کلام خود ایک قوی الاثر حقیقت ہے جو پڑھنے والے کے سمع و بصر سے گذر کر

دل پر قبضہ جمالیتا ہے اور تھوڑے وقت کے لئے اُس کو اُن لطیف جذبات کا مرکز بنادیتا ہے جو شاعر کے حساس دل میں ہنگامی طور پر اُٹھے تھے اور جن کی ترجمانی کے لئے وہ اُس وقت تک بے قرار رہا جب تک کہ ادا نہ کرچکا اور اگر اس کے کلام سے پڑھنے یا سننے والا متاثر نہیں ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کیفیت کا اعادہ نہیں کرسکتی جو شاعر کے دل پر وارد ہوئی مقدمہ نگار تو کیا شارح یا مفسر بھی یہ مشکل حل نہیں کرسکتا۔

لیکن "طرحِ نو" کا مقدمہ لکھنا ضروری ہے اس لئے کہ یہ جدید شاعری کی چڑھتی ہوئی ندی کی ایک ممتاز لہر ہے۔ اس کا وجود خود ایک ادبی انقلاب کا حصہ ہے۔ ادبی انقلاب! ماضی پرست طبائع کتنا ہی کیوں نہ گھبرائیں، کتنا ہی مقابلہ کیوں نہ کریں "نئی پود" ضرور پھل لائے گی "نیا رنگ" ضرور جمے گا۔ زمانے کا قوی ہاتھ کس کے روکے رُکا ہے!

نذیر میرزا برلاس بھی اُن انقلابی شعرا میں سے ہیں جنہیں کسی قوم کے ادب میں طرح نو ڈالنے کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ اس روش کا امام میر مہدی حسن مرحوم ہے جس کی "افادات" جدید طرزِ نگارش کا نمونہ ہے، جس نے اُردو زبان میں تنقیدِ عالیہ کا چرچا کیا اور جو اپنے رنگین مصطلحات کیلئے اردو زبان کا آسکر وائلڈ ہے۔ شاعری میں اس جدت کا سہرا اکبر الہ آبادی کے سر ہے، حالیؔ نے اُسے خوب نبھایا، اقبالؔ نے اُسے چار چاند لگا دیئے۔ آپ پوچھیں گے۔ یہ روش ہے کیا آخر! میں کہوں گا ——— مشاہدہ نگاری! غدر سے پہلے کے شعرا میں اس چیز کا فقدان تھا، وہ لوگ مضمون باندھا کرتے، تراکیب سجایا کرتے، تخیل کی دنیا بسایا کرتے، اپنے گرد و پیش کے حقائق ان کی طبع نازک پر ایک بار تھے۔ وہ مغلیہ شوکت کی سیجوں پر لیٹے تھے، ادبار کے کانٹوں کو کیسے ہاتھ لگاتے، ماضی کے رنگین خواب دیکھتے رہے، حال کے دلخراش حقائق سے آنکھیں بند رکھیں۔ مشاہدہ کا ورق مٹ گیا، مشاہدہ نگاری عنقا ہوگئی۔ کیا ہوا جو نظیر اکبر آبادی جیسے ایک آدھ صاحبِ نظر نے اس وادی میں نغمہ سرائی کی اور دنیا کے کان بند پاکر خاموش ہوگئے۔

اکبرؔ، حالیؔ، اقبالؔ تینوں اس دریا کے تیراک تھے لیکن ہر موج پر ہاتھ ڈالنے سے وہ

گریز کرتے، پردہ داری ان کا شیوہ تھا، عام معتقدات کا انہیں اکثر لحاظ رہا۔ ملیح آباد سے اک جوش اٹھا جس نے فرسودگی کے سارے پردے چاک کر دیئے۔ ہر چیز کو عریاں دیکھا اور عریاں ہی پیش کر دیا۔ مشاہدہ کو مشاہدہ ہی کی خاطر سپرد قلم کیا، قدما، کی طرح حقیقت کو شخصی رنگ آمیزی کا شکار نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اس طرف سب سے پہلا قدم یہ اٹھا کہ جذبات کا مرکز فطری محبوب یعنی عورت کو بنا دیا گیا۔ ساغر، حفیظ، علی اختر، روش صدیقی، اندر جیت شرما اور اختر شیرانی نے اس کی تقلید کی۔ عذرا، سلمیٰ اور ثریا ایسے حسین نام استعمال میں آنے۔ فخرئیہ میرزا برلاس اس جدید روش کے حامی ہیں، مشاہدہ نگاری میں آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے، اسی کو وہ شاعری کی جان سمجھتے ہیں۔ اپنی نظم 'گل فروش' میں کیا خوب کہا ہے ؎

گلوں میں پھرتی ہے یوں جیسے تیتری کوئی
چمن کی سیر کرے یا حسیں پری کوئی

دختر صحرا کی سادہ تصویر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں ؎

شانے ابھرے ابھرے سے ہیں بازو گورے گورے سے
ہرنی کی آنکھوں سی آنکھیں سرخ گلابی ڈورے سے
بکھری بکھری کالی زلفیں آنکھیں حیراں حیراں سی
بھیگی بھیگی رخ پر سرخی نظریں ہر سو رقصاں سی!

'کسان' کو کھیتوں کی طرف جاتا ہم اور آپ ہر روز دیکھتے ہیں، لیکن شاعر کے مشاہدہ میں یہ کیفیت نرالی ہے، کہتے ہیں ؎

ہاتھ پاؤں گو نہ سیدھے رات بھر سو کے ہوئے
ہر قدم پر ہے مگر انگڑائیاں روکے ہوئے

جدید شاعری کی ایک بڑی خصوصیت آزادی کی تڑپ ہے۔ شاعر یوں بھی اپنے ماحول کو اکثر تنگ پاتا ہے ؎ یک جہاں آں ہم از خون تمنا ساختی! کہکر 'موجود' سے منہ موڑ لیتا ہے

اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ایک نئے جہان کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب اس کی قوم عوارضِ غلامی میں مبتلا ہو اور اس کی طبع آزاد ہر قدم پر زنجیروں کی جھنکار سنے تو وہ اور بھی آتش زیر پا ہو جاتا ہے۔ ہمارے حالیؔ زابرلاس اسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک حقیقی شاعر کی مانند وہ بھی جہانِ آب و گِل کی ہوا کو اپنی طبع کے لئے ناساز گار پاتے ہیں اور ایک نئے جہان کی تلاش میں چل کھڑے ہوتے ہیں اور بڑے امید افزا لہجے میں پکارتے ہیں ؎

ہے اپنی آخری منزل شفق زادوں کی وادی میں

ساری نظم 'مسافر' پڑھ جائیے تو پتہ چلے کہ وہ کیسا جہان پُر کیف چاہتے ہیں۔ وہ کیسی حسن اور نغمہ کی وادی ہے جہاں پہنچکر ان کی روح کو قرار حاصل ہوگا۔ یہ تو ہے ان کی روحانی صعوبتوں کا علاج لیکن قوم کی ذہنی اور جسمانی غلامی کے خلاف وہ کس جوش سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ذرا سنئے تو انکا 'آزاد ملاح' کیا کہتا ہے ؎

لہروں کے نغمے سنتا ہوں، دریا کو گیت سناتا ہوں

فطرت کی پرستش کرتا ہوں، آزاد ترانے گاتا ہوں!

میں خود فطرت کا حصہ ہوں، آزاد ہوا میں پلتا ہوں

میں طغیانی پر ہنستا ہوں، میں طوفانوں سے لڑتا ہوں!

طغیانی پر ہنسنا اور طوفانوں سے لڑنا کس کا شیوہ ہے؟ مردان الوالعزم کا جن میں آزادی کی روح کوٹ کوٹ کر بھری ہو اور جو انقلابی ذہنیت سے بہرہ ور ہوں۔

جدید شاعری کی تیسری بڑی خصوصیت عالمگیر انسانی ہمدردی ہے۔ ذاتی ماحول کا تنگ دائرہ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو ایک شاعر کی ذہنی پرواز کو محدود نہیں کر سکتا۔ جدید شاعر بیسویں صدی کی بین الاقوامی فضا میں پلا ہے جبکہ پورا عالمِ انسانی ایک کنبہ میں سمٹ آیا ہے۔ پھر اُس کے بت شکن مزاج پر قومیت اور وطنیت کے بھونڈے بُت ایک بوجھ ہیں وہ انہیں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ ان کے پاؤں پر اسے خونِ بیکس کی سرخی نظر آتی

ہے، وہ پکار اٹھتا ہے ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اور یہی نہیں کہ اس دلخراش حقیقت پر آنسو بہانا جانتا ہے بلکہ ظالم کو ظلم کے انجام سے پوری قوت کے ساتھ آگاہ کرتا ہے اور مظلوم کو دلاسا دیکر انقلاب کا سبق دیتا ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے مجموعہ میں ہمارے میرزا ابرلاس نے بھی زندگی کی مختلف راہوں کے تین مظلوم پیش کئے ہیں۔ ننھا بھکاری، گلفروش حسینہ، مفلوک الحال کسان، تینوں کی پُر آلام زندگی ہمارے سامنے گذر رہی ہے، تینوں سرمایہ داری کی بے رحم چکی میں پستے نظر آتے ہیں، تینوں کی داستانِ الم خون کے آنسو رلا دینے کو کافی ہے لیکن آدمِ امروز ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شاعر شرمندگی سے سر جھکا لیتا ہے اور التجا کرتا ہے ؎

پھیر لیتے ہیں نگاہیں جس کو رہرو دیکھ کر
کاش خود فطرت کو رحم آجائے اُس کو دیکھکر

پھر ذرا دیکھئے تو کسان کو کس شوکت اور یقین سے دلاسا دیتے ہیں ؎

غم نہ کر محنت کے پتلے اے غریبی کے شکار!
جوش میں آئے گی اک دن رحمتِ پروردگار!
تیرے حق میں عنقریب اِک انقلاب آنیکو ہے
تیری چوکھٹ پر جبینِ وقت جھک جانیکو ہے

کسان کی چوکھٹ جہاں بےکسی ڈیرے ڈالے ہے، پیرِ مردِ زمانہ کی سجدہ گاہ بنی ہو اور دنیا کے تاجدار کھڑے حیرت سے تاکا کریں کتنی عبرت انگیز تصویر ہوگی یہ۔ غرض شاعرانہ ہمدردی کا بے پناہ جذبہ میرزا کے سینے میں پورے جوش سے موجزن ہے۔ اُنہیں حسرت رہتی ہے مگر کس چیز کی؟ خود گیسوئے فطرت سنوارنے کی اور ایک حقیقی شاعر کا منصب بھی یہی

ہے۔ چنانچہ 'گلفروش' کے مصائب گنا لینے کے بعد کس حسرت سے کہتے ہیں ؎

ستم ظریفیِ فطرت کو آج شرماؤں
جو اُس نے ہار گندھے ہیں اُسی کو پہناؤں

رجائیت جدید شاعری کی جان ہے۔ شاعر کتنا ہی مفلوک الحال ہو کتنا ہی آلام نصیب۔ دنیا اور دنیا والے اُسے کیسا ہی کیوں نہ ستائیں۔ حق کا دامن وہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اُسے حق کی آخری فتح کا یقین ہوتا ہے اور اُس کے نزدیک اس فتح کی ضامن حسن کی جاذبیت ہے۔

"Beanty is Truth Beanty" (Keats)

اُس کی حسن پرور زندگی کا پہلا اصول ہے۔ اُسے وہ کبھی نہیں بھلا سکتا اُسی کے سہارے وہ جیتا ہے اُسی عینک سے وہ اسرارِ عالم کی نقاب کشائی کرتا ہے اور پھر جدید شاعر ــــــ جدید شاعر نے تو زمانۂ حال کا اختلاف مذاہب دیکھا ہے 'عقایدِ انسانی کے گورکھ دھندے میں نظریں الجھائی ہیں' تکفیر کے چرچے سنے ہیں 'تضحیک کے خارستان سے گذرا ہے۔ اُسے کیسے یقین آئے کہ انسانی نجات کا آج کوئی ایک راستہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حُسن کے سوا انسان کسی اور نقطے پر جمع نہیں ہو سکتے۔ بنی آدم کا یہی ایک مرکز ہے یہیں پہنچکر اختلافات مٹ سکتے ہیں 'کھوئے ہوئے اعتبارات قائم ہو سکتے ہیں' مٹتے ہوئے اعتقادات از سرِ نو تازگی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہیں پہنچکر اس کی امیدیں روشن ہو جاتی ہیں اور اُس کے ارادے قوی۔ اسے انسانیت کا مستقبل درخشاں نظر آنے لگتا ہے۔ نذیر میرزا برلاس بھی اس رجائیت سے سرشار ہیں۔ وہ کسان کو دلاسا دیتے ہیں تو آنے والے دورِ کامرانی کا مژدہ سناکر 'گلفروش حسینہ کی تزئین خود اُس کے گندھے ہوئے ہاروں سے کرتے ہیں تو ستم ظریف فطرت کو شرما کر۔ دوست کا ریشمی آنچل تھامے ایک نامعلوم دنیا کی تلاش میں رواں ہیں۔ کہتے ہیں ؎

"روح کی گہرائیوں میں گونجتے ہیں تیرے گیت
مسکرا کر دیکھتا جا اور یونہی گاتے جا

ایک نامعلوم دنیا میں پہنچنا ہے ہمیں!
اور اس دنیا کو جاتا ہے یہ رنگیں راستہ
ہاں وہ نامعلوم دنیا چاند اور تاروں میں ہے"

شاعر کے ذہن میں اس دنیا کا دھندلا سا خاکہ موجود ہے لیکن وہاں پہنچنے تک حسن کی رہبری لازمی ہے۔ اس کے بس میں ہو تو اتنا طویل سفر کر کے "افق کے اس طرف والی رنگین وادی" کو خود نہ جائے بلکہ اس وادی کا نقشہ اسی دنیا میں کھینچ دے لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا والے حسن کے دیوتا سے ہوس پروری کی مرادیں مانگنا جانتے ہیں۔ اپنی کائنات کو حسین بنا دینے کی التجا نہیں کرتے۔ مجبور ہو کر وہ اپنی حسین دنیا الگ آباد کرتا ہے۔ کیسی دنیا؟ ؎

اودی اودی گھٹاؤں کی دنیا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی دنیا
بہکی بہکی فضائیں ہیں جس کی
مہکی مہکی ہوائیں ہیں جس کی
بھیگی بھیگی ہیں چاندنی راتیں
شعر، نغمہ، شراب کی باتیں

میرزا برلاس کے کلام کی اپنی دو ممتاز خصوصیتیں ہیں۔ رنگینی اور کیف۔ سارے مجموعہ کو پڑھ جائیے اول سے آخر تک کوئی خشک اور بے کیف مصرعہ نظر نہیں پڑے گا۔ گویا ایک نرم رو ندی ہے کہ چاندنی رات میں اپنی نرم خیز لہروں کو گودی میں لئے چلی جا رہی ہے۔ یا ایک حسین دیوی ہے۔ کہ اپنے گداز جسم کو چادر نوریں میں لپیٹے مستانہ وار قدم اٹھائے جاتی ہے۔ جس طرح ان دونوں کے نظارے سے ایک سکون پرور کیف طاری ہو جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح میرزا برلاس کا کلام پڑھنے سے دل و دماغ مسرور ہوتے ہیں۔ ان کی نظم "چھیڑ خوانی" کیسی کیسی لطافتوں کا گلدستہ ہے فرماتے ہیں ؎

مسکراؤں گا فضاؤں میں تبسّم بن کر
گیت گاؤں گا ہواؤں میں ترنّم بن کر

اور سب سے زیادہ رنگینی اور کیف ان کی اس آرزو سے ٹپکتے ہیں جو انہوں نے "نوائے شاعر" کے مقطع میں کی ہے۔ کہا ہے ؂

کاش میرے مقصدِ فطرت کی یوں تکمیل ہو
میری ہستی ایک رنگیں شعر میں تبدیل ہو

یہ رنگین شعر کیا ہے ؟ جہانِ حسن وکیف کا ایک لازوال ذرّہ ـــــ ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر انجام کیا ہو گا

خدا کرے میر تنا برلاس کی یہ رنگین آرزو پوری ہو۔

پروفیسر کلیم آفغانی ۔ ایم ۔ اے

تخیّلات

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

رنگین وادی

افق کے اُس طرف کہتے ہیں اک رنگین وادی ہے

وہاں رنگینیاں کہسار کے دامن میں سوتی ہیں!

گلوں کی نکہتیں ہر چار سُو آوارہ ہوتی ہیں!

وہاں نغمے صبا کی نرم رو موجوں میں رہتے ہیں

وہاں آبِ رواں میں مستیوں کے رقص بہتے ہیں

وہاں ہے ایک دنیائے ترنم آبشاروں میں وہاں تقسیم ہوتا ہے تبسم لالہ زاروں میں

سنہری چاند کی کرنیں وہاں راتوں کو آتی ہیں!

وہاں پریاں محبت کے خدا کے گیت گاتی ہیں

کنارِ آب حسن و عشق باہم سیر کرتے ہیں

گئی گزری غلط فہمی کا ذکرِ خیر کرتے ہیں

وہاں کے رہنے والوں کو گنہ کرنا نہیں آتا

ذلیل و مبتذل جذبات سے ڈرنا نہیں آتا

وہاں اہلِ محبت کو نہ کوئی نام دھرتا ہے
وہاں اہلِ محبت پر نہ کوئی رشک کرتا ہے
محبت کرنے والوں کو وہاں رسوا نہیں کرتے
محبت کرنے والوں کا وہاں چرچا نہیں کرتے

ہم اکثر سوچتے ہیں تنگ آ کر کہیں چل دیں
مری جاں اے مرے خوابوں کی ملکہ چل وہیں چل دیں
اُفق کے اُس طرف کہتے ہیں اک رنگین وادی ہے

(ایک رومانی سفر)

مسافر

ہے اپنی آخری منزل شفق زاروں کی وادی میں
جہاں ہوتا ہے آوارہ تبسم لالہ زاروں میں
جہاں گیتوں کی پریاں کھیلتی ہیں آبشاروں میں
جہاں مستی میں آکر پھول خوشبوئیں لٹاتے ہیں
جہاں چشمے "محبت کے خدا" کے گیت گاتے ہیں
جہاں ہرسو فضا پر خوبصورت خواب چھائے ہیں
جہاں صحنِ چمن میں ابر کے رنگین سائے ہیں
جہاں چشموں کی لہروں پر مسرت رقص کرتی ہے
جہاں کی زندگی حسن اور نغموں میں گزرتی ہے
جہاں اپنا گیا گزرا زمانہ یاد آتا ہے
جہاں بیتا ہوا رنگیں فسانہ یاد آتا ہے

بڑھے جاتا ہوں نامعلوم نغموں کی صداؤں میں
کوئی مجھ کو لئے جاتا ہے ان رنگیں فضاؤں میں

مجھے اس چاند اور تاروں کی بستی سے گزرنا ہے

مجھے قوسِ قزح کی وادیوں میں سیر کرنا ہے

ہوائیں رقص کرتی ہیں فضائیں مسکراتی ہیں

صدائیں آرہی ہیں جیسے پریاں مل کے گاتی ہیں

شفق زاروں کی وادی نیند اور خوابوں کی وادی ہے

شفق زاروں کی وادی حسن اور نغموں کی وادی ہے

ہے اپنی آخری منزل شفق زاروں کی وادی میں

جوانی

مرے خیال میں کیفیتیں جھلکتی ہیں
مرے ارادوں سے رنگینیاں ٹپکتی ہیں

ہر اک حسین تمنّا میں رنگ بھرتا ہوں
جسے میں حسن کی دیوی کی نذر کرتا ہوں

ہر ایک شے مجھے گرویدگی سکھاتی ہے
مری جوانی محبّت میں بدلی جاتی ہے

مجھے فضا میں ترنّم سنائی دیتے ہیں
مجھے گلوں میں تبسم دکھائی دیتے ہیں

ہوائیں جھوم کے نغمے سنا رہی ہیں مجھے
گلوں کی نکہتیں وحشت سکھا رہی ہیں مجھے

ترانے عشق کے سنتا ہوں آبشاروں سے
میں چھینتا ہوں حسین پھول لالہ زاروں سے

فضاؤں میں نظر آتے ہیں کچھ حسیں جلوے
کہ جیسے خواب کی دنیا کے شرمگیں جلوے

تصوّرات میں پہروں خوشی مناتا ہوں
کسی کو ساتھ لئے بادلوں میں جاتا ہوں

یہ کون دور سے نغمے سنائے جاتا ہے
کوئی تو چاند میں بیٹھا مجھے بلاتا ہے

یہ چاہتا ہوں کہ مل جاؤں جاکے تاروں میں
جوانی اپنی گزر جائے ماہ پاروں میں

حسیں ارادے ہیں تسکین کامرانی ہے
جہانِ کیف و مسرّت مری جوانی ہے

شفق

منظر

افق پر چھا رہی ہے کیف زا ہلکی سی رنگینی — چھڑک دی جائے جیسے ساغرِ صہبا کی رنگینی

فضا پر ہر طرف چھائے ہوئے رنگین بادل ہیں — کہ لہرائے ہوئے سے خواب کی پریوں کے آنچل ہیں

ہوا کی لرزشوں میں ایک خوابیدہ ترنم ہے — جہاں مخمور ہے ہر سو تبسم ہی تبسم ہے

شباب و حسن کی شعریتیں منظر پہ چھائی ہیں — شراب و شعر کی کیفیتیں کیا رنگ لائی ہیں

تاثرات

شفق ہے یا کبھی دیکھا ہوا خوابِ مصور ہے[۱] — جوانی کے دنوں کا یا کوئی رنگیں تصور ہے

شفق آرامگاہِ ناز ہے معصوم نغموں کی — شفق رنگین دنیا ہے مرے آوارہ خوابوں کی

جنوں سودا میں رہتا ہے اسی رنگین دنیا کے — کئی افسانے کہتا ہے اسی رنگین دنیا کے

تخیل مجھکو لیجاتا ہے اس رنگین دنیا میں — یہ رہبر مجھکو پہنچاتا ہی اس رنگین دنیا میں

وہاں میں ابر کے سائے میں پہروں گیت گاتا ہوں

"محبت کے خدا" کو بے پناہ نغمے سناتا ہوں

ح۱ میں اس قافیہ کو جائز سمجھتا ہوں۔

مصوّر کا خواب

تخیّل کی حسیں دنیا کا اک رنگیں جزیرا ہے

فضا کی وسعتوں کو چاند کی کرنوں نے گھیرا ہے
درختوں کے سیہ سایوں میں نیندوں کا بسیرا ہے
لطافت ناز سے ہر پھول کے دامن میں سوتی ہے
کہ جیسے زندگی تصویر میں خوابیدہ ہوتی ہے
ترنّم کھیلتا پھرتا ہے چشموں کی روانی میں
ادا سے رقص کرتے ہیں گلوں کے عکس پانی میں
بہت دھیمے سُروں میں اک صدا گانے کی آتی ہے
کہ جیسے کوئی دوشیزہ مقدس گیت گاتی ہے

بڑھے جاتا ہوں نامعلوم نغموں کی صداؤں میں   مقدس جاذبیت کارفرما ہے فضاؤں میں

دکھائی دے رہی ہے دور اک اونچی عمارت سی
بہت اونچی فلک فرسا عمارت "قصرِ شہرت" کی
مرے لینے کو پریاں اس کے دروازے پہ آتی ہیں

بڑی حیرت سے تکتی ہیں ادا سے مسکراتی ہیں
مجھے "شہرت" نے آخر فخر بخشا باریابی کا
مرے سر تاج رکھا میرے فن کی کامیابی کا
غرض "شہرت کی دیوی" دیکھتی ہے مجھ کو شفقت سے
میں بڑھکر دستِ نازک چوم لیتا ہوں عقیدت سے
طلسم خواب بوسہ کی صدا سے ٹوٹ جاتا ہے
مرا یہ "خواب رنگیں" مجھ کو اکثر یاد آتا ہے
اسی کی شعریت رنگوں کی آمیزش میں آئی ہے
یہی "کیفیت خوابِ" اپنی تصویروں پہ چھائی ہے
تخیّل کی حسیں دنیا کا اک رنگیں جزیرا ہے

نظم معرا

خواب بیداری

دوست یہ رنگیں فضائیں اور گھٹا چھائی ہوئی
نکہتیں دوشِ صبا پر ہر طرف اڑتی ہوئی
آسماں پر اودی اودی بدلیاں بکھری ہوئی
آ رہی ہے دور سے معصوم گیتوں کی صدا
مجھ کو یوں محسوس ہوتا ہے ابھی سو جاؤں گا
تو سنائے جا کوئی رومان پرور داستاں

رہنمائی میں تری بڑھتا چلا جاتا ہوں میں
جا رہی ہے دور تک سر سبز پیڑوں کی قطار
گونجتی ہے وادیوں میں آبشاروں کی صدا
چومتی پھرتی ہے ہر سُو لالۂ خودرو صبا
یہ فرازِ کوہ کی راہیں لکیروں کی طرح
ایک نامعلوم دُنیا کی طرف جاتی ہوئی

مل گئی ہیں جا کے سب قوس قزح کی راہ سے
ابر کے رنگین سایوں میں بڑھے جاتا ہے تو
ریشمی آنچل ترا تھامے ہوئے میں ساتھ ہوں
کیوں پلٹ کر دیکھتے ہی مسکرا دیتا ہے تو
میری آنکھوں کی چمک میں خواب تو رقصاں نہیں؟
راستہ قوسِ قزح کا کس قدر رنگین ہے
روح کی گہرائیوں میں گو بجتے ہیں تیرے گیت
مسکرا کر دیکھتا جا اور یونہی گائے جا
ایک نامعلوم دنیا میں پہنچنا ہے ہمیں
اور اُسی دُنیا کو جاتا ہے یہ رنگیں راستہ!
ہاں وہ نامعلوم دنیا چاند اور تاروں میں ہے"

کیا کہا اے دوست! کیوں ہوں سوچ میں ڈوبا ہوا
کیا کبھی دیکھے نہیں ہیں تو نے بیداری میں خواب؟
سن رہا ہوں میں تری رومان پرور داستاں

شاعر کی دنیا

(۱)

میری دنیا حسین دنیا ہے

جس میں سورج ہے چاند تارے ہیں   روز و شب حسن کے نظارے ہیں
شب کی محفل سجی ہے تاروں سے   جی بہلتا ہے ماہ پاروں سے
رات کو تارے جگمگاتے ہیں   خود بخود گیت یاد آتے ہیں
کرنیں لیتی ہیں روپ پریوں کا   چاند راتیں ہیں رقص کے دریا
ہیں شعاؤں میں بجلیاں رقصاں   امڈ آئے ہیں نور کے طوفاں
لالہ زاروں میں پھول نکھرے ہیں   آبشاروں میں گیت بکھرے ہیں
موجیں انگڑائی لے کے چلتی ہیں   لہریں بہتے ہوئے مچلتی ہیں
ہر طرف بکھرے بکھرے گیسو ہیں   اور آنکھوں میں پریم جادو ہیں
مسکراہٹ میں بجلیاں پنہاں   دل کی بربادیوں کے ہیں ساماں
ہر طرف حسن ہے جوانی ہے   کامرانی ہے شادمانی ہے

میری دنیا حسین دنیا ہے

مشاہدات

گل فروش

یہ نازنیں کہ جسے قاصدِ بہار کہیں
جواں حسینہ کہ فطرت کا شاہکار کہیں

پیام آمدِ فصلِ بہار دیتی ہے
جنوں نصیب دلوں کی دعائیں لیتی ہے

اِسے چمن کے ہر اک پھول سے محبت ہے
اِسے بہار کی رعنائیوں سے الفت ہے

گلوں میں پھرتی ہے یوں جیسے تیتری کوئی
چمن کی سیر کرے یا حسین پری کوئی

جو پھول چنتے ہوئے نغمے گنگناتی ہے
یہ شاید اپنی جوانی کے گیت گاتی ہے

شباب نے اسے تمکنت سکھا دی ہے
غریب ہی سہی "پھولوں کی شاہزادی" ہے

جہان والوں کا حسنِ سلوک دیکھا ہے
اِسے زمانے کی بیرحمیوں سے شکوہ ہے

گزر رہے ہیں شب و روز دستکاری سے
شباب کاٹ رہی ہے یہ کتنی خواری سے

خودی کا درس ہے افسانۂ حیات اسکا
جواب پیدا کرے گی نہ کائنات اسکا

اسے زمانے کی نیرنگیوں کا ہوش نہیں
مری نظر میں یہ دیوی ہے گلفروش نہیں

ستم ظریفیِ فطرت کو آج شرماؤں
جو اس نے ہار گندھے ہیں اسی کو پہناؤں

آزاد ملّاح

مشرق کے دریچہ سے جب سب رنگ دیوتا صبح جھانکتا ہے
دریا سے اٹھتی موجوں پر اک رنگیں سایہ کانپتا ہے
سورج کی روپہلی کرنیں میری پیشانی چومتی ہیں
آزاد ہوا کے جھونکوں میں نورانی پریاں جھومتی ہیں
جس کشتی میں شب گزری ہے موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے
لہروں کی زد سے بچتی ہے ساحل سے جا ٹکراتی ہے
دریا کی لہروں کے نغمے ایسے سننے میں آتے ہیں
کہ جیسے میری بے فکری کی نیندوں سے شرماتے ہیں
کیا وقت سہانا ہوتا ہے یہ فطرت کے نظاروں کا
ہر موج لئے بہتی ہے پرتو رخصت ہوتے تاروں کا
میں ایسے میں جاگ اٹھتا ہوں اٹھ کر انگڑائی لیتا ہوں
منظر پہ نگاہیں پڑتی ہیں ہنستا ہوں کشتی کھیتا ہوں

لہروں کے نغمے سنتا ہوں دریا کو گیت سناتا ہوں

فطرت کی پرستش کرتا ہوں آزاد ترانے گاتا ہوں

میں خود فطرت کا حصّہ ہوں آزاد ہوا میں پلتا ہوں

میں طغیانی پہ ہنستا ہوں میں طوفانوں سے لڑتا ہوں

منجدھار میں جب لہروں کے طوفاں کشتی سے ٹکراتے ہیں

یہ اونچے اونچے پربت میری ہمت سے شرماتے ہیں

بادل برسے بجلی چمکے طغیانی یا طوفان آئے!

ناممکن ہے ماتھے پہ بل ہمت میں فرق اک آن آئے

جب بادل گھر کر آتے ہیں میں خوابوں میں کھو جاتا ہوں

کشتی کو بہا دیں چھوڑ کے سستاتا ہوں سو جاتا ہوں

یہ کشتی میری دنیا ہے میں دنیا کا پابند نہیں

ہر چیز میسّر ہے مجھ کو سو شکر کہ حاجت مند نہیں

جب تک ہیں توانا یہ بازو میں کشتی کھیتے جاؤں گا

ہر روز نئے منظر ہونگے آزادی کے گُن گاؤں گا

دن رات اسی میں بیتے ہیں دن رات اسی میں بیتیں گے

سب کھیل ہیں یہ آزادی کے کیا ہارینگے کیا جیتیں گے
بچپن میں فسانے سنتا تھا کس شوق سے ایک جزیرے کے
(پریوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ سیلاب زدہ کشتی گھیرے)

اک روز مری کشتیٔ دل سیلاب زدہ کہلائے گی
دنیا کے لئے میری ہستی اک افسانہ بن جائے گی

دخترِ صحرا

دور افق پر ہلکی ہلکی سرخی چھائی جاتی ہے
اور مشرق کی جانب سے تاریکی بڑھتی آتی ہے
ویرانے میں بیٹھا ہوں جی بستی سے گھبراتا ہے
سامنے کی پگڈنڈی سے اک قافلہ گزرے جاتا ہے
آگے آگے اِک دوشیزہ قدم بڑھائے آتی ہے
الھڑپن کا یہ عالم ہے ہر سو چھائے جاتی ہے
پھٹے پرانے کپڑوں میں سے جوبن پھوٹا پڑتا ہے
ذرہ ذرہ دھرتی کا پاؤں پر ٹوٹا پڑتا ہے
شانے ابھرے ابھرے سے ہیں بازو گورے گورے سے
ہرنی کی آنکھوں سی آنکھیں سرخ گلابی ڈورے سے
بکھری بکھری کالی زلفیں آنکھیں چین اِک حیراں سی
بھیگی بھیگی رُخ پر سُرخی نظریں ہر سو رقصاں سی

راہ پہ چلتے چلتے دھیمے دھیمے گائے جاتی ہے
دور اُفق پر نظریں گاڑے قدم بڑھائے جاتی ہے
گیتوں کی لَے جیسے بن میں کوئی کوئل کوک اُٹھے
جس کو سنکر سننے والے کے سینے سے ہوک اُٹھے
گھبرا گھبرا کر تکتی ہے یوں شہری آبادی کو
گویا ڈر ہے لوٹ نہ لے آ کر کوئی آزادی کو
اس کی دنیا ڈھور اور ڈنگر یہ صحرا کی بیٹی ہے
شہری دنیا کی نظروں میں گو قسمت کی ہیٹی ہے
یہ پروردہ ہے فطرت کی دیوی ہے آزادی کی
رونق صحرا صحرا کی آبادی وادی وادی کی
ندی نالوں کی لہروں سے اس نے گانے سیکھے ہیں
اور ہوا کے جھونکوں سے آزاد ترانے سیکھے ہیں
پُر معنی خاموشی اس نے سیکھی ہے ویرانوں سے
پہروں بچپن میں کھیلی ہے صحرائی طوفانوں سے
یہ کیا جانے دنیا والے کیونکر مر مر جیتے ہیں

اک جینے کی خاطر غم کے زہر پیالے پیتے ہیں
یہ اس دنیا میں بستی ہے جس میں غم کا نام نہیں
جس کے رہنے والے سکھ سے جینے میں ناکام نہیں

آنکھوں آنکھوں میں ہنس ہنسکر دعوت صحرا دیتی جائے

کاش یہ بکھری زلفوں والی ساتھ مجھے بھی لیتی جائے

کِسان

یہ نظم ڈسٹرکٹ نمائش کمیٹی کوہاٹ کے انعامی مشاعرہ یکم مارچ ۳۳ء میں پڑھی گئی اور بہترین نظم قرار پائی۔ ایک نقرئی کپ انعام ملا۔

برلاس

رات کی تاریکیوں پر روشنی چھانے لگی
چاندنی کے نور میں دن کی چمک آنے لگی

آشیانوں میں پرندے دیر سے بیدار ہیں
جھلملاتے ہیں ستارے صبح کے آثار ہیں

چھیڑتی ہے آ کے جب پیپل کے پتوں کو ہوا
کان میں پڑتی ہے دھیمی کھڑکھڑاہٹ کی صدا

گاؤں کے کچے گھروندوں میں وہ سناٹا نہیں
اب درختوں کے سیہ سایوں سے ہول آتا نہیں

منہ اندھیرے اک تنومند اور قوی ہیکل جواں
جوت کر ہل گاؤں سے کھیتوں کی جانب ہے رواں

اپنے فرضِ زندگی کے فکر میں کھویا ہوا
یوں قدم اُٹھتے ہیں جیسے ہو ابھی سویا ہوا

ہاتھ پاؤں گو نہ سیدھے رات بھر سو کے ہوئے
ہر قدم پر ہے مگر انگڑائیاں روکے ہوئے

چیتھڑے ہو ہو رہا ہے تن پہ گاڑھے کا لباس
روح کو محنت سے اطمینان لیکن جی اداس

چلچلاتی دھوپ میں پھر کل چلائیگا یہ ہل
لیکن آنے پائیگا نہ اِسکی پیشانی پہ بل

دوپہر کو پیڑ کے سائے میں جب ستائیگا
کچھ حسیں خوابوں میں محنت کا صلہ مل جائیگا

اس کی ان خوابوں کا مرکز لہلہاتی کھیتیاں
لہلہاتی کھیتیوں سے اسکی امیدیں جواں

کام کا بندہ ہے یہ کیا واسطہ آرام سے
سابقہ پڑتا ہے اسکو نت نئے آلام سے
موسمی بارش پہ ہوگا جسکی روزی کا مدار
پیس نہ ڈالیگی اسکو گردشِ لیل و نہار؟
درحقیقت اسکو محنت کا صلہ ملتا نہیں
سچ ہی قسمت میں لکھا ہو جو سوا ملتا نہیں
سال بھر کی محنتِ شاقہ سے کیا مل جائیگا
اسکی قسمت میں نہیں کچھ سوکھے ٹکڑوں کے سوا
سال کے بارہ مہینے اسکو رہنا قرضدار
یہ غریب انسان ہے سرمایہ داری کا شکار

غم نہ کر محنت کے پتلے اے غریبی کے شکار
جوش میں آئیگی اکدن غیرتِ پروردگار
تیرے حق میں عنقریب اک انقلاب آنیکو ہے
تیری چوکھٹ پر جبینِ وقت جھک جانیکو ہے
تنگدستی سے پریشاں کیوں ہوا جاتا ہے تو
فخر ہونا چاہئے تجھ کو کہ ان داتا ہے تو
اس زمیں کے بسنے والے جتنے انساں آج ہیں
زندہ رہنے کیلئے یہ سب ترے محتاج ہیں
تیری محنت کا ثمر کھا کھا کے دیتے ہیں دعا
تیرے بل بوتے پہ پلتے ہیں سبھی شاہ و گدا
ملک کا تجھ کو شہ بے تاج ہونا چاہئے!
اور ہندوستاں پہ تیرا راج ہونا چاہئے!

ننّھا بھکاری

قصّہ خوانی[1] پر حسیں کیفیتیں چھانے لگیں
زندگی کی مستیاں ہر سو نظر آنے لگیں
ڈوبتے سورج کے سائے ہر طرف چھائے ہوئے
موڑ پر ننھا بھکاری ہاتھ پھیلائے ہوئے
اِک طرف عشرت کا اِک امڈا ہوا سیلاب سا
اِک طرف اِک بھیک منگا مضطرب بیتاب سا
جسم سے کپڑوں کی میلی دھجیاں چپکی ہوئی
یعنی سر سے پاؤں تک بدبختیاں لپٹی ہوئی
ہاتھ پاؤں مضمحل جی مضطرب نظریں اداس
اور چہرے پر بھیانک بھوک کے خوف و ہراس
بچپنے کی سادگی، شوخی، ہنسی، باقی نہیں
اس کی اِن مُردہ رگوں میں زندگی باقی نہیں

[1] پشاور کا بڑا بازار

کوئی کچھ دے یا نہ دے مجبورِ عادت ہے مگر
التجا کرتا ہے ہر رہرو کا دامن تھام کر
بھیک کی عادت سے خودداری کا جذبہ کھو چکا
اس ذرا سی عمر میں احساس مردہ ہو چکا
عمر بڑھتی جائے گی مجبور ہوتا جائے گا
اور احساسِ خودی سے دُور ہوتا جائیگا
پھیر لیتے ہیں نگاہیں جس کو رہرو دیکھ کر
کاش خود فطرت کو رحم آجائے اسکو دیکھ کر
تانبے اور چاندی کے یہ سکے نہ ہونے چاہئیں
اسکے اِن ننھے سے ہاتھوں میں کھلونے چاہئیں

تاثرات

نوائے شاعر

شمع میخانہ ہوں بزمِ دہر میں جلتا ہوں میں
اک شراب و شعر کے ماحول میں پلتا ہوں میں

کوندتی ہیں بجلیاں میرے دلِ بیتاب میں
خوبصورت آرزوئیں دیکھتا ہوں خواب میں

رات کی تاریکیوں میں اک صدا سنتا ہوں میں
اپنی ذہنی کیفیت پر پہروں سر دھنتا ہوں میں

آپ اپنے شعر پڑھکر وجد میں آتا ہوں میں
ایک روحانی نشے میں غرق ہو جاتا ہوں میں

دلفریب الفاظ میرے ترجمانِ زندگی
میں کہا کرتا ہوں اکثر داستانِ زندگی

اک خیالی رازداں سے دردِ دل کہتا ہوں میں
چاندنی راتو! کسی کا منتظر رہتا ہوں میں

خوبصورت چاند اور تارے مرے ہمراز ہیں

آسماں کے رہنے والے سب کے سب ہمسا نہیں
میں امانت دار ہوں اک سرمدی پیغام کا
اہلِ دل میں تذکرہ ہوتا ہے میرے نام کا
روحِ خوابیدہ کو پیغامِ عمل دیتا ہوں میں
آرزوؤں کو ارادوں میں بدل دیتا ہوں میں
حسن کو کیف آفریں رنگینیاں دیتا ہوں میں
عشق کو صد شورشِ آہ و فغاں دیتا ہوں میں
حسن کی دلچسپیاں وابستہ میری ذات سے
کھیلتی ہیں چاند کی کرنیں مرے جذبات سے
وقف ہمدردی مری سارے زمانے کے لئے
چند آنسو لیکے پھرتا ہوں بہانے کیلئے
مشورے ہوتے ہیں میرے وقتیے تدبیر سے
میں گلے کرتا ہوں پہروں گردشِ تقدیر سے
کاش میرے مقصدِ فطرت کی یوں تکمیل ہو
میری ہستی ایک رنگیں شعر میں تبدیل ہو

حُسن

حُسن! تو صنعت گرِ فطرت کا اک شاہکار ہے

تیرے باعث اس جہاں کی رونق بازار ہے

زندگی بخشی گئی ہے چاندنی کے نور کو!

یا مجسّم کر دیا ہے شعلہ ہائے طور کو

تیرے باعث اِک زمانہ ہے پرستارِ حیات

تیرے اندازِ تبسّم سے جواں ہے کائنات

منتظر نظروں کے افسانے سنا کرتا ہے تو

طور در آغوش روز و شب رہا کرتا ہے تُو

کتنی دلکش جاذبیت تیرے افسانوں میں ہے

خود ترا خالق بھی تیرے چاہنے والوں میں ہے

تیری دزدیدہ نگاہی پر جہاں کو ناز ہے

تیرے اک پنہاں تبسّم میں جہانِ راز ہے

ناز کرتے ہیں ترا دیوانہ ہو کر اہلِ ہوش

بے زبانوں تک ہیں دنیا میں ترے حلقہ بگوش
چاند کی روپہلی کرنیں تیری نظروں کے نثار
رشکِ صد فردوس ہے تیری جوانی کی بہار
کائناتِ شوق کی ہر چیز دیوانی تری
والہانہ چومتا ہے عشق پیشانی تری
تیرے خواہشمند خاطر میں نہ لائیں تاج کو
تیری خاطر چھوڑ دیتے ہیں ہزاروں راج کو
تیری نسبت سے کئی گمنام شہرت پا گئے
تیری چاہت سے کئی دیوانے عزت پا گئے
کاش میں تجھ کو تغیر آشنا ہونے نہ دوں
انقلاباتِ زمانہ سے فنا ہونے نہ دوں

دوست سے

ہمیں زمانہ کے افکار سے غرض کیا ہے
جہاں میں رنج و مصائب سے کون بچتا ہے
اک آئے دن کے تغیر کا نام دنیا ہے
ہمارے اپنے خیالات رنج و راحت ہیں

اے دوست! آ کہ جوانی کی یاد میں گائیں
فسانے عہدِ محبت کے مل کے دہرائیں
پھر اپنے پر وہی بیتا زمانہ لے آئیں
ہماری زندگی روشن ہے ان فسانوں سے

گلوں کی اوٹ میں چھپتی ہوئی ملاقاتیں
لجا لجا کے تمہاری وہ پیار کی باتیں
مرے دماغ پہ چھائی ہیں وہ جواں راتیں
ہمارے کتنے حسیں خواب تھے جوانی کے

مرے جوانی کے خوابوں میں مسکراتے ہو

مرے خیال کی دنیا میں چھپ کے آتے ہو
مرے حسین ارادوں پہ چھائے جاتے ہو
تمہارے حسن سے ہے زندگی حسین میری

ہمارا عشق حقیقت میں جاودانی ہے
ہماری زیست کا ہر لمحہ غیر فانی ہے
ہماری زندگی اِک مستقل کہانی ہے
جہاں کو یاد رہے گا ہمارا افسانہ

ایک گیت

انتظار

گھنگھور گھٹائیں ہیں آوارہ ہوائیں ہیں
رنگین فضائیں ہیں گیتوں کی صدائیں ہیں
اے جانِ تمنا کیا ایسے میں نہ آؤ گے؟

ندی کے کنارے ہیں آکاش پہ تارے ہیں
قدرت کے نظارے ہیں موہ لیتے ہیں پیارے ہیں
اے جانِ تمنا کیا ایسے میں نہ آؤ گے؟

ساون کی جواں راتیں دن رات کی برساتیں
جی چاہے ملاقاتیں اور پریم بھری باتیں
اے جانِ تمنا کیا ایسے میں نہ آؤ گے؟

پھر فصلِ بہار آئی سامانِ جنوں لائی
بن جاؤں نہ سودائی ہو جائے نہ رسوائی
اے جانِ تمنا کیا ایسے میں نہ آؤ گے؟

اک اور ہی دنیا ہو   دنیا سے الگ جا ہو
سر میں ترا سودا ہو   اے کاش کہ ایسا ہو
اے جانِ تمنا کیا ایسے میں نہ آؤ گے؟

گڑیا کی لوری

[چہار سالہ معصوم بچی اختری جب بھی گڑیا سے کھیلا کرتی کچھ زیر لب گنگناتی۔
اس گنگنانے کو میرے تخیل نے لوری سمجھا اور ذیل کے اشعار موزوں ہو گئے]

سو جا میری پیاری سو جا
میری راج دلاری سو جا
سو جا میری پیاری سو جا

رات اندھیری بادل برسے — تو نہیں سوئے شاید ڈر سے
ننھی گڑیا ڈر کس کا ہے — ہم ہوں پاس تو ڈر شے کیا ہے
ابا۔ امی سب سوتے ہیں — دھندوں سے بے غم ہوتے ہیں

سوئے دنیا ساری سو جا
سو جا میری پیاری سو جا
میری راج دلاری سو جا

ان بفکروں کی نیندوں کو — ہم نہ ہونگے ترسے گی تو
ہم تو اور کہیں جائیں گے — اور کہیں جا سکھ پائیں گے

لیکن تیرا ساتھ نہ چھوٹے   ناممکن یہ رشتہ ٹوٹے

ہم تیرے تو ہماری سوجا

سوجا میری پیاری سوجا

میری راج دلاری سوجا

سوجا میری پیاری سوجا

یہ دنیا ہے رام کہانی   ہم تم سارا عالم فانی

غم سے چھوٹا وہ جو سویا   یہ دنیا سپنا ہے گویا

آ ہم تم مل کر سو جائیں   دنیا سے غافل ہو جائیں

دنیا غم کی ماری سوجا

سوجا میری پیاری سوجا

میری راج دلاری سوجا

سوجا میری پیاری سوجا

تلقین

(۱)

سکوتِ شب سے میری روح کو تسکین ہوتی ہے
کہیں تاریکیوں میں جاکے کھو جاتے ہیں ہنگامے
تھکے، ماندے ذرا سی دیر سو جاتے ہیں، ہنگامے
بہت جمعیتِ خاطر سے شب بھر غور کرتا ہوں
گزشتہ زندگی کی لغزشوں پر غور کرتا ہوں
سرِ نو زندگی اوقات پر تقسیم کرتا ہوں
عمل کی زندگی کی اس طرح تلقین ہوتی ہے

(۲)

سحر کے وقت گہری نیند سے بیدار ہوتا ہوں
میں اپنی روح میں اک تازگی محسوس کرتا ہوں
میں اپنے خون میں اک زندگی محسوس کرتا ہوں
ارادوں میں تمناؤں میں اک ہیجان ہوتا ہے

مرے سینے میں اِک جذبات کا طوفان ہوتا ہے
مری رگ رگ میں احساسِ عمل بیدار ہوتا ہے
مرے ہر فعل سے اِک جوش کا اظہار ہوتا ہے
بدی کی قوتوں سے برسرِ پیکار ہوتا ہوں

متفرقات

جلا کر آسماں رکھدیں اُلٹ کر یہ زمیں رکھدیں
کسی کے آستاں پر آ کھینچیں او جبیں رکھدیں

فلک بجلی گرائے باغباں ظلم و ستم توڑے
یہ اپنے چار تنکے ہی اٹھا کر ہم کہیں رکھدیں

سر سودا زدہ ہیں مضطرب سجدے معاذ اللہ
کسی کا سامنا ہو پائے نازک پر جبیں رکھدیں

فرشتے لیتے جائیں اپنے دامن میں مرے آنسو
محبت کے ستارے عرش اعلیٰ کے قریں رکھدیں

نذیران کی شباب افروز لغزش کا تقاضا ہے
خراب شوق سجدہ حاصل دنیا و دیں رکھدیں

شبِ خاموش کے معصوم تارے یہ نہ سمجھیں گے
کوئی حسرت زدہ کیوں دیکھتا ہے ماہِ تاباں کو

الٰہی بے خودی میں کیا ہوئی ہم سے خطا سرزد
تماشائی بڑی حسرت سے تکتے ہیں گریباں کو

کبھی تو چین سے سوئے گا راتوں جاگنے والا
کبھی تو موت آئیگی تیرے بیمارِ ہجراں کو

مری مجبوریوں پر مسکراتا ہے جنوں میرا
الٰہی کوئی آفت لے گرے دیوارِ زنداں کو

پریشاں خاطری میں لب پہ کیوں آئے دعا میری — نہ رسوائے جہانِ آرزو ہو گی وفا میری

مجھے عہدِ گزشتہ کی وفائیں یاد آتی ہیں — مری اس انتہا سے خوب تھی وہ ابتدا میری

مری فطرت کا مقصد ہے تغیر آشنا رہنا — نہ غم ہی مستقل میرا نہ راحت دیرپا میری

مقدر میں نہیں ہے کامرانِ آرزو ہونا — سزاوارِ اجابت ہو نہیں سکتی دعا میری

نذیر اپنے جنوں کی شوخیاں ہیں یاد اب تک
طبیعت تھی قیامت کی سکوں نا آشنا میری

انوکھی تمنائیں دل میں بسائیں — نئی مورتوں سے یہ مندر سجائیں

یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ اودی گھٹائیں — بہت آج اکسا رہی ہیں فضائیں

گناہوں کی دنیا سے اکتا چلے ہیں — کہیں چل کے اک اور بستی بسائیں

ہر اک جا مرے تذکرے ہو رہے ہیں — مجھے لے اڑی ہیں جنوں کی ہوائیں

کسی دن خودی میں الاپے تھے نغمے — ابھی گونجتی ہیں انہی کی صدائیں

ہماری کہانی بہت مختصر ہے!
جو سننا نہ چاہیں انہیں کیا سنائیں

کبھی پاسِ وفا نہ کیجیے گا　　　مہربانی ذرا نہ کیجیے گا

مے سے نفرت سہی مگر واعظ　　　مفت مل جائے کیا نہ کیجیے گا

جی رہے ہیں اسی سہارے پہ　　　اپنا وعدہ وفا نہ کیجیے گا

ہم پشیماں ہوئے گلہ کر کے
آپ عذرِ جفا نہ کیجیے گا

اسی سلسلہ کی دوسری کتابیں

نمبر	کتاب	مصنف
۱	سوشلزم	فریڈرک اینگلز
۲	سرمایہ داری	عبداللہ ملک
۳	کارل مارکس	باری
۴	انقلاب فرانس	باری
۵	راجہ اور کسان	لیونارڈ اِم شف
۶	سٹالین	مارشل وارشلوف
۷	عناصر تہذیب	ولڈیورنٹ
۸	عصمت اذونو	ثریا اندرعمان
۹	پھول اور کانٹے	گوپال متل
۱۰	شہنشاہ حبشہ	اختر اورینوی
۱۱	جاگیرداری	عبداللہ ملک
۱۲	مشین اور مزدور	باری
۱۳	محمد عربی	باری
۱۴	ہندوستان کے لیڈر	یوسف مہر علی
۱۵	اقبال اور اُسکا پیغام	پروفیسر خاور
۱۶	گورکی کی ڈائری	حسن عباس
۱۷	سبھاش بوس	گوپال متل
۱۸	رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا
۱۹	ٹراٹسکی	نریندر ناتھ سیٹھ
۲۰	فاسزم	ہیرلڈ لاسکی
۲۱	گاندھی	گوپال متل
۲۲	جواہر لعل نہرو	گوپال متل
۲۳	آمریت	اکرام قمر
۲۴	تاریخ کیا ہے ؟	باری
۲۵	ہمارا لینن	مائل ملیح آبادی
۲۶	ابوالکلام آزاد	عبداللہ بٹ
۲۷	ہماری زبان	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۲۸	افادی ادب	اختر انصاری
۲۹	احساس کمتری	شیر محمد اختر
۳۰	صاحب اور مذہب	لیونارڈ اِم شف
۳۱	لینن (بحیثیت ایک انسان)	کلارا زٹکن
۳۲	طرح نو	نذیر مرزا برلاس

رپن پریس، لاہور